تصدیق

جلد ۰۲ شمارہ ۰۵، ۲۰۲۳

Article

A Critical Analysis of *Makalat Hafiz Mehmood Sherani*

مقالات حافظ محمود شیرانی کا تجزیہ

Dr Sadaf Naqvi*[1] Asia Sattar[2], Dr Farzana Riaz[3]

[1] Assistant Professor, [2]MPhil Scholar, Department of Urdu, Government College Women University, Faisalabad, [3]Government College University, Lahore

*Correspondence: sadafnaqvi@gcwuf.edu.pk

[1]ڈاکٹر صدف نقوی، [2]آسیہ ستار، [3]ڈاکٹر فرزانہ ریاض

[1]صدر شعبہ اُردو، [2]ایم فل سکالر، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد، [3]گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210
DOI:https://doi.org/10.56276/nvwste94
Received:24-12-2023
Accepted:12-01-2024
Online: 12-01-2024

Copyright: © 2023 by the authors.

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Hafiz Muhammad Sherani was a modern scholar of his time and a "Man of Research". He is counted among the genius working people. "Makalat-e-Sherani" has been compiled by this grandson Mazher Mahmood Sherani in eight volumes. These articles are very important and a beacon for future researchers. The 1st and 2nd volumes of "Makalat Sherani" are about the beginning and evolution of the Urdu Language. Volume 3rd contains five main articles on classical literature and 4th volume is based on Ferdowsi. Volume five criticized "Sher ul Ajam" and 6th deals with Persian literature. 7th volume of "Makalat-e-Sherani" about "Raj Rasa" and volume 8th related to books on syllabus and coins.

KEYWORDS: Research, Literature, Urdu Language, Sher-ul-Ajam, Persian, Bacon.

حافظ محمود شیرانی اُردو تحقیق و تدوین کے معلم اوّل ہیں۔ اُردو تحقیق کو انھوں نے ایک مضبوط بنیاد فراہم کی ہے۔ اُن کی تحقیق کا انداز جداگانہ تھا۔ وہ کسی ماہر وکیل کی طرح تحقیق کا مقدمہ لڑنے کے لیے محنت کرتے، مفروضہ تیار کرتے اور دلائل اکٹھے کرتے اور پھر

اُس کو صداقت کی کسوٹی پر پرکھتے۔ انھوں نے کبھی بھی متقدمین کی بات کو حرفِ آخر تسلیم نہیں کیا۔ خود اپنے تلاش کردہ حقائق میں بھی تحقیق کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ حافظ محمود شیرانی اعلیٰ پائے کے محقق تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ لکھتے ہیں:

> "دنیا میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کی سیرت اور شخصیت میں قدرت بے شمار ایسے اوصاف و فضائل جمع کر دیتی ہے کہ ان میں سے ہر صفت تنہا بھی قبول عام و عظم کی ضامن ہو سکتی ہے۔ پروفیسر شیرانی بھی انہی افراد میں سے تھے۔ بے عدیل محقق اعلیٰ پائے کے مورخ اور عالی مرتبہ نقاد۔"(۱)

حافظ محمود شیرانی نے قدیم اُردو اور دبستان اُردو کے حوالے سے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ "پنجاب میں اُردو" شیرانی صاحب کی ایک اہم کتاب ہے جس نے اُنھوں نے پہلی بار یہ نظریہ پیش کیا کہ اُردو کا آغاز پنجاب سے ہوا۔ حافظ محمود شیرانی نے قدرت اللہ قاسم کے تذکرے "مجموعہ نغز" کی تدوین بھی ہے۔ اُنھوں نے فردوسی پر بھی چار مقالے تحریر کیے ہیں۔ آپ نے محمد حسین آزاد کی کتاب "آبِ حیات" پر بھی تنقید کی اور اسے ایک غیر مستند کتاب قرار دیا۔ تاریخی اور ادبی حوالے سے اس کی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی۔ تاریخی تنقید کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی کا اہم مضمون "شعر العجم پر تنقید" ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے لسانیات، ادبی تحقیق، تحقیق و تنقید متن، ادبی تنقید اور تاریخ کے حوالے سے اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ نذیر احمد اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> "شیرانی صاحب کی تحقیق راہِ ہدایت کی شمع ہے۔ اُنہوں نے موجودہ نسل کی راہنمائی کے لیے کافی سامان اکٹھا کر دیا ہے۔ اس تاریخ ساز شخصیت کے لیے سب سے بڑا اخراجِ تحسین یہی ہے کہ آپ تحقیق کی روایت کے حامل بن جائیں جس کے بنانے میں ان کا زبردست ہاتھ ہے۔ میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جدید دور کا کوئی محقق یا نقاد ہند و پاکستان میں ایسا نہیں ہے جس کو شیرانی کی تحریر سے رہنمائی نہ ملی ہو۔"(۲)

ان کے مضامین مقالات شیرانی کے نام سے آٹھ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے۔ مقالات شیرانی کو اُن کے پوتے مظہر محمود شیرانی نے مرتب کیا۔ مقالات شیرانی کی جلد اوّل میں اُردو زبان اور اس کے آغاز و ارتقا کے متعلق مضامین ہیں۔ شمالی ہند میں دسویں اور گیارہویں صدی میں اُردو کی نشوونما کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں اس میں افضل جھنجھانوی کے بارہ ماسہ کا بھی ذکر ہے۔ مقالات شیرانی کی جلد سوم میں اُردو کے کلاسیکی ادب پر پانچ اہم مقالے ہیں۔ میر قدرت اللہ خان قاسم اور اُن کی تالیف "مجموعہ نغز" تنقید بر آب حیات، دیوان ذوق اور مرزا غالب کے کلام کے حوالے سے تنقید ہے۔ حافظ صاحب کی "مجموعہ نغز" پنجاب یونیورسٹی کے سلسلہ نشریات میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوتی تھی۔ اس کے آغاز میں مصنف کے حالات کے ساتھ ساتھ کتاب کا مختصر تعارف بھی دیا گیا ہے۔ اس میں "مجموعہ نغز" کے آب حیات کا ماخذ ہونے کے لحاظ سے بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم کبھی کسی ادبی معرکے میں براہِ راست فریق نہیں بنتے تھے۔

حکیم صاحب کے بزرگوں کا پیشہ درس و تدریس اور پیری مریدی تھا۔ آخر الذکر کو ترک کر کے حکیم صاحب نے اس کی جگہ طباعت کا مفید پیشہ اختیار کر لیا تھا مگر اوّل الذکر تعلیم و تعلم کو معلوم ہوتا ہے کہ برابر جاری رکھا۔ فن شعر میں ان کے شاگردوں کی فہرست جہاں تک کہ تذکرہ ہذا کا تعلق ہے۔ نہایت مختصر ہے لیکن میں ایسے شاگردوں کے نام جن کا ذکر اتفاقیہ اس تذکرے میں آ گیا ہے۔ خواہ وہ بکتی شاگرد ہوں یا فن شعر کے یا محض کتابی تکرار کرنے والے، ان کا ذکر محمود شیرانی نے فرداً فرداً کیا ہے۔

۱۔ آفاق: میر فرید الدین اصل میں حکیم ثنا اللہ خاں فراق کے شاگرد ہیں، لیکن استاد کے کہنے سے حکیم صاحب کو بھی اپنا کلام دکھادیا کرتے ہیں۔

۲۔ احسن: احسن اللہ، حکیم صاحب ہی کے شاگرد ہیں۔

۳۔ اشرف: غلام اشرف، مجملہ دیگر کمالات، علم موسیقی میں پوری دست گاہ رکھتے ہیں۔ ساز سندر بین، ان کی ایجاد ہے۔

لیکن حکیم صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ جس کی بنیاد پر انہیں ہمارے ادبیات کی تاریخ میں ایک ممتاز جگہ مل گئی ہے۔ ان کی موجودہ تالیف ''مجموعہ نغز'' ہے۔ اس قابل قدر تالیف کی اہمیت اور اس کی صحیح رتبہ معلوم کرنے کے لیے اس شاخ ادب کی ان مصنفات کا ذکر کرنا ہو گا جو اس تذکرے سے پیشتر عالم وجود میں آچکی ہیں۔

''آبِ حیات'' کے واسطے ذخیرہ فراہم کرنے کے لیے بڑی کاوش اور تحقیق کرنی پڑی ہے۔ یہ تالیف کم از کم سات سال کی کمائی ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے ان لوگوں کے نام بھی گنوائے ہیں جنھوں نے ''آب حیات'' کے لیے امداد کا ہاتھ دراز کیا ہے۔ ان میں میر مہدی حسن فراغ، جناب رعمی، سید احمر، میر علی حسن رشک، مولوی شریف حسین خان، آغا کلب عابد خان، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، نواب ضیا الدین خان اور نواب علاؤ الدین خان والئی لوہارو قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر کا ذکر خود آزاد نے بھی آبِ حیات میں کر دیا ہے۔ مگر شیرانی دو خطوں کا خصوصی طور پر ذکر کرتے ہیں جو مولانا کو ان کے استفسارات کے جواب میں وصول ہوئے۔ ان میں پہلا خط تو نواب علاؤ الدین خان کا ہے جو مولانا کے سوالات کا جواب دے کر ان دو چار روز کے لیے لوہارو آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ خط ۲۸ جون ۱۸۷۶ء کا لکھا ہوا ہے۔

حافظ محمود شیرانی نے آبِ حیات پر اپنے مقالے کو سات سالوں کی کمائی قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ مولانا آزاد اپنے انداز کے آپ ہی موجد تھے اور آپ ہی خاتم تھے۔ ''شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد اور دیوانِ ذوق'' کے آغاز میں حکیم صاحب نے اس کا تعارف کرایا ہے یہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں سپردِ قلم کیا تھا جب ان کی صحت گر گئی تھی اور وہ اپنے وطن ٹونک میں مقیم تھے۔ کتب خانے کا بیشتر حصہ پنجاب یونیورسٹی کے سپرد کر چکے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ میں ایک ایسے مقام میں مقیم ہوں جہاں بیٹھ کر انسان پر تلاش کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون میں دو ایک جگہ بعض سنین وغیرہ سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ ان کی عادت تھی کہ جب تک واقعات و سنین کی پوری تحقیق نہ کر لیتے تحریر میں نہ لاتے تھے۔ یہ مضمون تین حصوں میں منقسم ہے:

۱۔ تنقید دیوان ذوق مرتبہ آزاد

۲۔ دیوانِ ذوق پر آزاد کی اصطلاحات

۳۔ دیوانِ ذوق میں آزاد کے اضافے

یہ تینوں حصے رسالہ ”ہندوستانی الٰہ آباد میں سات قسطوں میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلی قسط ۱۹۴۴ء اکتوبر کے شمارے میں اور آخری قسط حافظ صاحب کی وفات کے بعد جنوری واپریل ۱۹۴۷ء کے پرچے میں چھپی۔

جلد چہارم میں فردوسی کے متعلق اشعار ہیں۔ حافظ محمود شیرانی صاحب نے اُردو فارسی زبان وادب کے سینکڑوں موضوعات کے بارے میں مواد فراہم کیا اس نئے اور اچھوتے مواد ادبی تاریخ کو مالا مال کر دیا ان کی حیثیت ایک ساز محقق و نقاد کی ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے فارسی ادب کے اکثر اہم مسائل پر فاضلانہ اور محققانہ گفتگو کی ہے۔ ان کا دل پسند موضوع فردوسی اور شاہنامہ فردوسی پر ہزاروں صفحے لکھے گئے لیکن ان میں تکرار ہے تکرار کی وجہ سے کثیر الحجم مواد اکٹھا ہو گیا۔ شیرانی صاحب نے آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے فردوسی پر لکھنا شروع کیا۔ اس وقت یورپ میں اس پر کام ہو چکا تھا لیکن ایران میں بھی طفولیت کے دور سے گزر رہا تھا۔

یہ بات بھی اہم ہے کی یورپی محققین فردوسی کے متعلق کوئی چونکا دینے والی چیز پیش نہ کر سکے۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں رسالہ اورنگ آباد میں شاہنامے کی نظم کے اسباب اور زمانے کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں ثابت پہلی داستان ہے جو منظوم ہوئی۔ اس داستان کے چند سال وقفے کے بعد شاہنامے کا آغاز ہوا جو کئی سال کی طویل مدت کے بعد مکمل ہوا۔

فردوسی کا نام حکیم ابوالقاسم حسن پور علی طوسی معروف بہ فردوسی ہے۔ وہ دسویں صدی عیسوی (چوتھی صدی ہجری) کے نامور اور معروف فارسی شاعر ہیں۔ شاہنامہ فارسی ادب میں ممتاز مقام رکھنے والی تصنیف ہے جو فارسی شاعر فردوسی نے تقریباً ۱۰۰۰ء میں لکھی۔ اس شعری مجموعہ میں ”عظیم فارس“ کے تہذیبی اور ثقافتی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مجموعہ تقریباً ۶۰۰۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس ادبی شاہکار، شاہنامہ میں ایرانی داستانیں اور ایرانی سلطنت کی تاریخ شاعرانہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ شاہنامہ ۳۵ سال کی طویل مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس مدت میں فارسی زابن میں بھی طویل و تفسیر رونما ہوا ایہی تفسیر شاہنامہ کی ابتدائی اور آخری حصے کی نظموں کے باہمی مقابلے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس تفاوت کی ایک ابتدائی شکل نظموں میں الف زائدہ کا استعمال اور تدریجاً اس کا عدم استعمال ہے۔ شیرانی صاحب لکھتے ہیں کہ

> ”الف اشباع کا استعمال نہ تقلید عربی فردوسی سے سابق اساتذہ رود کی و دقیقی کے یہاں کثرت سے ملتا ہے۔ دقیقی کے ہزار اشعار میں جو شاہنامے محفوظ ہیں کئی موقع پر نظر آتا ہے۔ یہ الف بفرض تحسین کلام اسم اور فعل دونوں کے آخر میں لایا جاتا ہے۔ مبالغہ لیا جا سکتا ہے الف کا استعمال داستان بیژن نے ۳۷ موقعوں پر ہوا ہے۔ جو بجائے خود ایک قابلِ حیرت معاملہ ہے کیونکہ باقی شاہنامہ میں

ایسے الف کی مثالیں پندرہ سے زیادہ نہیں ملیں گی۔ اس سے یہی پایا جاتا ہے کہ داستان بیژن شاہنامے سے بہت پہلے لکھی گئی ہے جبکہ فردوسی اپنا انداز خاص قائم نہیں کر چکا تھا۔"(۳)

حافظ شیرانی صاحب کا دوسرا کارنامہ فردوسی کی طرف منسوب ہجو یہ اشعار کی تنظیم ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو داد تحقیق دی ہے وہ ہر طرح کی تعریف و توصیف سے مستغنیٰ ہے۔ پہلے اشعار ہجو میں ہر شعر کی اصل سے بحث کی گئی ہے اور یہ پتہ چلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ماخذ کیا ہے؟ اس بحث کے بعد کے نتائج یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر اشعار مصنوعی اور جعلی ہیں۔ کچھ اشعار شاہنامے میں دوسرے مواقع پر کیے گئے ہیں ان کو ایک سلسلہ کے ساتھ پیش کرتے ہجو کی روایت کو پختہ کیا گیا ہے۔ کچھ اشعار دیگر اساتذہ سے لیے گئے ہیں اور کچھ اشعار ایسے ہیں کہ جن کی اصلیت واضح ہو سکی ہے۔ ہجو کی روایت جب شروع ہوئی تو چند شعر ہجو یہ متعین ہوئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔ چھٹی صدی کے بعد نظامی عروضی نے صرف چھ شعر دیے ہیں اور اب ان کی تعداد ایک سو پچاس ہو گئی ہے۔

پروفیسر شیرانی نے ہجو کے اشعار پر مفصل بحث کی وہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جو اصول مد نظر رکھے ہیں اس کی بنیاد پر یہ مقالہ ادبی تحقیق کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ ایران میں کسی شخص نے فردوسی صاحب کے اشعار کے بارے میں قابل ذکر بات نہیں کی یہ ایران کے سب مایہ ناز شاعر اور فارسی زبان کے شاہکار کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔ نصر اللہ فلسفی محمود غزنوی کا ذکر تو کیا لیکن عرب اور ترک بھی اس ایرانی فلسفے کے حملے سے محفوظ نہ رہ سکے۔

"فردوسی اپنے اجداد کی طرح آرزومند تھا کہ ایران کے پاک نزاد اور ایرانی بادشاہوں کی نسل سے کوئی بادشاہ اس وطن (ایران) کا حکمران ہو تا کہ عرب بادیہ نشین کا دست تسلط کوتاہ اور وحشی اور ویران کرنے والے ترکوں کے منحوس قدم سے سرزمین ایران پاک ہو۔ وہ محمود غزنوی جیسے بے ہنر غلام کو ایران کے تخت پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔"(۴)

جس شخص نے سرسری طور پر بھی شاہنامے کا مطالعہ کیا اس کے نزدیک یہ بیان کھوکھلا اور بے بنیاد ہے۔ ایک اور ایرانی محقق ڈاکٹر صفا لکھتے ہیں:

"شاہ نامہ کے محمود غزنوی کی خدمت میں تقدیم کرنے کے بعد فردوسی ہمیشہ اس پر نظر ثانی کرتا رہا۔ چنانچہ اپنی وفات کے قریبی ایام میں ایک بار اس پر کلی طور پر نظر ثانی کی کچھ اشعار بڑھائے اور بعض اشعار میں تغیر و تبدل کیے اور شاہنامے میں یہ شاعر کی آخری تجدید نظر تھی اور آج شاہنامے کے متداول اور مشہور نسخے اسی آخری نسخے پر مبنی ہیں۔ اس نسخے میں ہجو نامہ شامل تھا اور وہ فردوسی کے مرنے کے بعد منتشر ہوا۔ اس میں صرف چھ بیت باقی رہ گئے ہیں۔ پوری طرح قابلِ

قبول نہیں۔۔۔ اس کے نزدیک فردوسی محمود غزنوی کا ہجو نامہ اپنی زندگی میں منتشر نہیں کر سکا۔
میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہجو نامہ میں الحاقی اور جعلی ابیات ہیں بھی تو ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس
کے بیشتر ابیات حقیقی ہیں۔ ان کی اصالیت پوری طرح واضح ہے۔"(۵)

شاہنامہ کے متعلق سے شیرانی صاحب کا اہم کارنامہ یوسف زلیخا کے فردوسی کی طرف انتساب کا اعلان ہے۔ شیرانی صاحب نے یہ مضمون آج سے تقریباً ۵۸ سال قبل رسالہ اُردو اپریل ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ یوسف زلیخا کی نسبت فردسی کی طرف ایک ایسی حقیقت بن چکی تھی جو ہر قسم کے شبہ سے پاک سمجھی جاتی تھی۔

مغرب کے فضلا کی تحقیق نے اس پر ایسی مہر ثابت کر رکھی تھی کہ اس بارے میں کسی شبے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ شیرانی صاحب کی تحریرات سے پہلے ایرانی ادیب اس اعلیٰ پایہ کے شاعر کے بارے میں تحقیقی کام سرانجام نہ دے سکی کوئی چونکا دینے والی بات مشرقی یا مغربی محقق کے قلم سے نہ نکلی۔ ہندوستان میں سب سے پہلے پروفیسر شیرانی نے آواز اُٹھائی اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسے مضبوط دلائل پیش کیے کہ آج تک ان پر کسی قسم کا اضافہ نہیں ہو سکا۔

شیرانی صاحب نے مثنوی یوسف زلیخا سے ایسے الفاظ، فقرات، محاورات، ترکیبات، اشعارات وغیرہ کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں جو فردوسی کے زمانے میں وجود میں نہیں آئے تھے۔ کوئی نسبت نہیں شیرانی صاحب کے اس طریق استدلال سے ان کا تحقیق میں رتبہ دوسرے محققین سے بلند ہے۔ شاہنامے کے دیباچہ قدیم کا تعلق بھی فردوسی سے نہیں یہ ایک شاہنامے کا مقدمہ ہے۔ شیرانی صاحب نے اس بارے میں محکم دلائل پیش کیے۔ مرزا محمد قزوینی نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کی بحث کا نتیجہ یہ ہے:

"یہ مقدمہ اگرچہ ہمیشہ شاہ نامہ فردوسی کی ابتدا میں ملتا ہے اور اگرچہ اس کے آخر میں فردوسی اس
کے شاہنامہ اور سلطان محمود کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود ظن قوی ہے جس کے متعدد قرائین
ہیں کہ اس مقدمہ کا بڑا حصہ یعنی تقریباً ۵/۴ حصہ ابتدا سے فردوسی اور شاہنامہ وغیرہ کے ذکر کے
قبل تک شاہنامہ فردوسی کا مقدمہ نہیں ہے بلکہ فردوسی کے علاوہ دوسرے شاہنامہ کا مقدمہ ہے اور
شاہنامہ فردوسی پر تقدم زمانی رکھتا ہے۔"(۶)

حافظ محمود شیرانی بلاشبہ ایک مستند محقق جنہوں نے اُردو اور فارسی کے بعض گمشدہ خزانے تلاش کیے اور ان نکات پر بحث کر کے تحقیق کا حق ادا کر دیا۔

مقالات شیرانی جلد پنجم میں صرف ان بیانات سے بحث کی گئی ہے جن میں مصنف کا مولانا شبلی سے تاریخی یا تنقیدی وجوہ پر اختلاف ہے۔ حافظ محمود شیرانی "شعر العجم" کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

"علامہ شبلی نعمانی اس تصنیف کے دوران میں مورخانہ و محققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی

حد تک غافل رہے ہیں۔ رطب و یابس جو کچھ ان کے مطالعے میں آجاتا ہے۔ بشرطیکہ دلچسپ ہو، حوالہ قلم کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ مولانا اپنے پچھلے بیانات کی آگے جا کر خود تردید کر دیتے ہیں۔"(۷)

شیرانی کے نزدیک شبلی کی تاریخی معلومات محدود ہیں۔ شعرائے عجم کے حالات لکھتے ہوئے ان کے طاقت ور قلم سے بہت سی لغزشیں ہو گئی ہیں۔ سنین پر توجہ نہیں دی گئی۔ متاخرین اور متقدمین کا فرق روا نہیں رکھا گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اجتہادی ضرورت کو استعمال نہیں کیا۔ دو مختلف آرا کو جرح و تعدیل کے بغیر مدعا اور مدعاعلیہ دونوں کو خوش کرنے کی بے سود کوشش کی ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ شبلی کے نزدیک بزرگوں کی باقیات کو ردوقدح سے غلط ثابت کرنا ہماری شان اخلاق کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ جو معلومات آسانی سے میسر آسکیں انھوں نے اسی پر اکتفا کیا ہے اور زیادہ تحقیق و تلاش سے کام نہیں لیا۔ جہاں ہمارے پیش نظر مقالات شیرانی جلد پنجم ہے جو ''شعر العجم'' جلد اوّل و دوم میں موجود تسامحات کا احاطہ کرتی ہے۔

شہید بلخی کے سلسلے میں علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے نامور فلسفی اور حکیم تھے۔ عربی و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ متعدد شعرا نے ان کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے لیکن شیرانی کو اعتراض ہے کہ علامہ شبلی نے ان کے حوالے سے صرف سطحی معلومات پر اکتفا کیا ہے۔ حالات اور وجاہت پر کماحقہ اعتنا نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں یہ مورخ کا فرض ہوتا ہے کہ مشاہیر رجال کے حالات پر جو کچھ ملے انہیں صفحہ قرطاس کے حوالے کر دے لیکن قدما کے حالات میں تاریخ نے زیادہ تر بخل سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشاہیر رجال کے حالات ہم تک قلت کے ساتھ پہنچے ہیں۔ رودکی کے سلسلے میں حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''یہ مشہور آفاق شاعر آدم الشعرا مانا جاتا ہے، اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ علامہ نے اس کے واقعات قلم بند کرنے میں زیادہ تحقیق اور تلاش سے کام لیا ہو گا اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے تو ایسا ہی خیال گزرتا ہے لیکن میں ناظرین کو آغاز داستان میں ہی اطلاع دے دیتا ہوں کہ شعر العجم میں رودکی کا افسانہ ایک دل فریب اور دلکش سراب کے منظر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔"(۸)

دقیقی کے متعلق علامہ شبلی نے لکھا کہ نوح نے دربار میں بلا کر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی۔ اس نے کم و بیش بیس ہزار اشعار لکھے جب کہ بعض کے نزدیک صرف ایک ہزار شعر تھے، جو آج شاہنامے میں شامل ہیں۔ جب ایک مورخ کے سامنے دو روایتیں ہوں تو اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ معتبر روایت کی تحقیق کرے لیکن مولانا کوئی تنقیدی فیصلہ نہیں دیتے۔ مولانا شبلی کہتے ہیں کہ دقیقی کے زمانے تک فارسی زبان میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ گویا دونوں کے ملنے سے ایک نئی زبان پیدا ہو گئی تھی۔ دقیقی نے فارسی کو عربی کی آمیزش سے پاک کر کے مستقل زبان کی حیثیت دی لیکن پروفیسر شیرانی اس کی تردید کرتے ہیں کہ یہ ادعا تاریخ اور قانون قدرت دونوں کے خلاف ہے لیکن اگر یہ دعویٰ سلجوقی دور کے لیے کیا جاتا ہے تو صحیح مانا جاتا۔ زبان کسی تنہا شخصیت کی ملکیت نہیں ہوتی کہ اس کی

تنہا کوشش اس میں انقلاب پیدا کر سکے۔ ہر دور کی زبان مختلف ہوتی ہے اور ہر شاعر اپنے عہد کی زبان ہی استعمال کر کے کامیاب ہوتا ہے کیوں کہ اگر کوئی شاعر ولؔی کے عہد کی زبان میں شعر کہہ کر شہرت حاصل کرنا چاہے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

شعر العجم کی دوسری جلد میں علامہ شبلی نعمانی نے چنگیز خان کے ظلم و ستم اور تباہی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ شہروں کے شہر بے چراغ ہو گئے۔ علم خزانوں کا ایک ایک ورق اُڑ گیا لیکن اسلام ایسا سخت جان تھا کہ ان ہنگاموں میں بھی زندہ بچ گیا۔ جوں ہی تاتاریوں کا طوفان تھما اسلام کی دبی ہوئی چنگاریاں ابھریں اور اس طرح پھیلیں کہ ایک بار پھر تمام عالم مطلع انوار ہو گیا۔ تاتاری لوٹ مار کے سوا کچھ نہ جانتے تھے اس لیے مسلمانوں سے اعانت کے سوا چارہ نہ تھا۔ چنگیز خان کے بعد اس کا پوتا ہلاکو بن تولی بن چنگیز خان تخت نشین ہوا تو اس نے محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا۔ اس کا بیٹا نکودر دار نے وزیر سلطنت خواجہ شمس الدین محمد کی ترغیب سے مسلمان ہو کر اپنا نام محمد رکھا۔ ترکوں نے بگڑ اکر ارغون خاں کی افسری میں اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

حافظ محمود شیرانی کے نزدیک محقق طوسی کی وزارت کا قصہ کسی اصلیت پر مبنی نہیں۔ ہلاکو کا پہلا وزیر سیف الدین بہادر بن عبد اللہ خوارزمی ہے جو دشمنوں کی بدگوئی کی بنا پر ہلاکو کے حکم سے ہلاک کر دیا جاتا ہے اس کے بعد صاحب دیوان شمس الدین محمد جوینی منصب وزارت پر سرفراز ہوتے ہیں۔ سلطان محمود کا اصل نام نکودار نہیں بلکہ تکدار، توکدار یا تکودار تھا وہ ۶۸۰ھ میں قتل نہیں ہوتا کیوں کہ وہ ۶۸۱ھ میں تخت نشین ہوتا ہے اور دو سال دو ماہ حکومت کرنے کے بعد قتل ہوتا ہے۔ سلطان احمد سے ترکوں کی مخالفت مذہبی نہیں سیاہی تھی کیوں کہ وہ تخت نشین ہونے سے پہلے اسلام قبول کر چکا تھا۔ دوسرے دعوے داروں کے باوجود باہمی اتفاق سے سلطان احمد بادشاہ بنایا جاتا ہے۔

ارغوں ہلاکو خان کا سب سے بڑا پوتا اور اباکا خان کا فرزند اکبر ہے وہ باپ کے تخت کا دعوے دار تھا۔ احمد نے کئی لڑائیوں کے بعد اس کو گرفتار کر کے قتل کرنے کے بجائے قید کر دیا۔ ارغون کے طرف داروں کی مضبوط جماعت نے پہلی ہی رات سازش کر کے اسے آزاد کرا دیا اور احمد کو قتل کر کے ارغون کو بادشاہ بنا دیا۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں جنگی جذبات کے فنا ہونے سے طبیعتوں پر اثر تصوف کے علاوہ غزل گوئی کی سورت میں نمایاں ہوا جس کی ابتدا شیخ سعدی اور اس کے معاصرین سے ہوئی۔ حافظ شیرانی کہتے ہیں:

> ”جنگی جذبات کی معدومیت اگر ایران میں غزل کے وجود کی ذمہ دار ہے تو آخر اس عہد کے ہندوستان کو کیا ہوا تھا؟ یہ ملک چنگیزی سیلاب سے بالکل مامون رہا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی خسرو اور حسن دہلوی جیسے غزل گو موجود ہیں۔ تصوف مغلوں کی آمد سے بیشتر اکثر ممالک اسلام میں موجود تھا، البتہ ان کی آمد نے اس کی ترقی کی رفتار کو تیز کر دیا اور یہ تصوف ہے جس نے غزل گوئی کو حقیقی ترقی دی۔“(۹)

شبلی نعمانی نے سنائی، اوحدی، مولانا روم اور خواجہ فرید الدین عطار کو صوفیانہ شاعری کے چار ارکان کہا ہے جبکہ شیرانی کے

نزدیک اوحدی کا داخلہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے اوحدالدین کرمانی شاعر ہیں اور نہ اوحدی ان کا تخلص ہے اگر مولانا شبلی کی مراد اوحدی مراغی سے ہے تو ان کے پایے کے بلکہ ان سے بہتر درجنوں صوفی شعرا کا نام لیا جا سکتا ہے۔ شیخ فرید الدین عطار کے متعلق شعرالعجم میں پائی جانے والی چند تسامحات کا ذکر کرنے کے بعد حافظ محمود شیرانی نے شیخ عطار کے حالات، واردات عشق، وحدت وجود، قصائد، رباعیات، تصنیفات اور کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کتاب کا تیسرا حصہ ضمائم کے نام سے ہے جس میں فارس شاعری کی قدامت، ارتقائے عروض، ضمیمہ متعلق رباعی اور چند شعرا کا ذکر ہے۔ آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

حافظ محمود شیرانی صاحب مشرقی اور مغربی علوم سے بخوبی آگاہ تھے۔ بچپن میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد آپ نے انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی۔ اس کے علاوہ شعر و سخن سے بھی علاقہ رہا۔ عروض اور تاریخ گوئی میں مہارت حاصل کی۔

مقالاتِ شیرانی کی جلد ششم میں برعظیم پاکستانی و ہند میں فارسی ادب سے متعلق آٹھ مقالات شامل ہیں۔ مقالات کی ترتیب میں ان کے موضوعات کی تاریخی تقدیم و تاخیر کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ ان میں سے پہلے پانچ مضامین مختلف کتابوں پر تنقید و تبصرہ کے طور پر لکھے گئے ہیں جبکہ باقی مضامین میں اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اگرچہ نقطہ و نظر کو تخریبی طریقہ کار بھی سمجھا جاتا ہے۔ مظہر محمود شیرانی کے بقول:

> ”حافظ صاحب کے ہاں تنقید کے معنی تخریب نہیں بلکہ اس کا منتہائے مقصود بے عیب تعمیر ہے
> یوں سمجھے کہ ان کے ہاں تخریب صرف تعمیری اعتراض کی خاطر ہے۔“(۱۰)

ششم جلد کا پہلا مضمون ڈاکٹر اقبال حسین لیکچرار پٹنہ کالج کے انگریزی مقالے ”ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا“ پر تبصرہ کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر اقبال نے امیر خسرو سے پہلے کے چھ شعراء کا تذکرہ کیا ہے یعنی نکئی، رونی، مسعود سعد، تاج ریزہ، شہاب مہمراہ اور عمید شامل ہیں۔ حافظ صاحب نے کتاب کا خیر مقدم ان الفاظ میں کیا ہے:

> ”قدیم شعرائے ہند پر قلم اٹھانا کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا مترادف ہے اور ڈاکٹر اقبال حسین اس
> سنگلاخ اور بنجر زمین میں اپنی تیشہ زنی اور جگر کاوی پر مستحق مبارکباد ہیں۔“(۱۱)

شیرانی صاحب اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر اس میں چند شاعر از قسم حمید الدین مسعود شالی گوب، منہاج سراج بلکہ ناصر الدین قباچہ سے وابستہ شعراء شامل کر دیے جاتے تو کتاب زیادہ دقیق ہو جاتی۔ اس کتاب کے تبصرے کے موقع پر شیرانی نے ان چھ شعراء کے دواوین کے علاوہ ان سے متعلق جو مواد اِدھر اُدھر پھیلا تھا۔ اس پر بھی گہری نظر ڈالی ہے اور اس بنا پر ڈاکٹر حسین اقبال کی کتاب پر خاطر خواہ اضافہ کیا اور دیگر ذرائع کی مدد سے اقبال صاحب کی بعض اغلاط کی تصحیح بھی کی اور اس ضمن میں سنین و تاریخ کے تعین پر خصوصی توجہ بھی ہے۔

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے شیرانی صاحب نے کہا کہ اقبال حسین نے جو تاریخ وفات ابوالفرج رونی کی لکھی ہے وہ کچھ

ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔ شیرانی کے مطابق رونی کی وفات ۴۹۲ء کے کافی بعد ہوئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے دو نئے قصیدوں میں سے ایک نئے انداز میں استدلال کیا ہے۔ ایک قصیدے میں آیان اور عید کے ایک ساتھ وقوع سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ جشن ۱۱ ذی الحجہ ۴۹۵ء میں ہوا۔ اس سے رونی کی حیات ۴۹۵ء کے بعد تک ثابت ہے۔

ایک دوسرے قصیدے میں ماہ تیر اور روزہ کشائی و عید کا ایک ساتھ بیان کیا ہے۔ تقدیم سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ۴۹۷ء کو رمضان کی پہلی تاریخ تھی اس سے مزید ثابت ہوا کہ رونی یقیناً ۴۹۷ء تک تو زندہ رہے۔ اپنی کتاب میں ڈاکٹر اقبال حسین نے شاعر سعد سلمان کا حال زیادہ تر مرزا محمد قزوینی کے ایک رسالے سے بیان کیا ہے۔ شیرانی صاحب نے جب تبصرہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں کافی فرق ہے۔ حالانکہ قزوینی کا رسالہ شاعر مسعود سعد پر معلومات کا ذخیرہ ہے۔ شیرانی صاحب کو شکایت ہے کہ اقبال حسین صاحب قزوینی کے ممنون تو ہیں مگر انھوں نے اپنی ممنونیت کے اظہار سے گریز کیا ہے۔ بلکہ قزوینی سے جابجا اختلاف بھی کر بیٹھے ہیں۔ محمود شیرانی قزوینی اور اقبال صاحب کے بیانات کو جانچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی علمیت کو دکھانے کی کوشش وہاں انھیں ناکام ہی ہونا پڑا یعنی ڈاکٹر صاحب کو قزوینی سے اتفاق رائے کرنا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر اقبال کے مقالہ "ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا" پر جو تبصرہ شیرانی نے کیا ہے۔ اس سے اقبال حسین کے مقالے کی اہمیت تو کم نہیں ہوئی البتہ یہ مقالہ مزید نکھر کر سامنے آیا ہے۔ اس کے باوجود شیرانی صاحب لکھتے ہیں:

> "تاج ریزہ، شہاب مہمرہ اور عمید سنائی کے سلسلے میں تمام ذرائع سے معلومات فراہم کر لی گئی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ایک دراز عرصے تک ان شعرا پر جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے اس پر جدید اضافہ نہیں ہو سکے گا۔"(۱۲)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کتاب پر ان کا بے لاگ تبصرہ ضخیم کتابوں پر بھاری ہے۔ پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

> "انھوں (شیرانی) نے جس انداز میں تبصرہ کیا ہے، اس سے فن تبصرہ نگاری کے اصول مرتب ہو سکے ہیں۔"(۱۳)

جلد ششم کا دوسرا مقالہ شمس العلما عبدالغنی کی کتاب ہندوستان کے مغلوں سے قبل فارسی ادب پر تنقید کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مضمون انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اور اپنے وطن ٹونک جانے کے بعد سپردِ قلم کیا تھا۔ اسی بنا پر وہ اس تنقید کو تشنہ محسوس کرتے تھے مگر اس کے باوجود یہ تنقید نہایت مفصل اور معلومات افزا ہے۔ اس میں اتنا وافر قلمی و مطبوعہ ماخذوں سے فراہم کر دیا گیا ہے کہ مغلوں سے قبل فارسی ادب کی تاریخ مدون ہو سکتی ہے۔

شیرانی صاحب کے بقول اس کتاب میں شمس العلماء سے کئی کوتاہیاں ہوئی ہیں اور واقعات کچھ غلط درج ہو گئے اور بعض امور سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ شیرانی صاحب نے جو تبصرہ کیا ہے اس میں انھوں نے شمس العلماء کی نہ صرف تحقیقی خامیوں کی اصلاح کی بلکہ

مثبت قیمتی اضافے بھی کیے ہیں۔ حافظ صاحب نے اس کتاب میں جو چند ایک غلطیاں نکالی وہ یہ ہیں کہ شمس العلماء نے ابتدا میں ہی غیر ضروری باتیں کی ہیں اور تمہید کے طور پر اصل موضوع سے بہت دور نکل گئے ہیں اور اصل مدعا کہیں پیچھے رہ گیا۔ دوسرے باب میں بھی شیرانی کے مطابق انھوں نے غزنویوں سے متعلق بحث کی اور بہت سی بے موقع گفتگو کر گئے۔

حافظ شیرانی کے مطابق عبدالغنی نے اپنی کتاب میں بہت سی نامور شخصیات کا ذکر بہت ہی نامناسب مقام پر درج کر دیا ہے۔ جو کہ ان کی متزلزل شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً علامہ الدین جہانسوز کا ذکر خاندان غلاماں کے آخر میں ملتا ہے۔ حالانکہ اسے غوریوں کی تفصیل کی ابتدا میں آنا چاہیے تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ باتیں عبدالغنی کی علمیت کی کج روی کی مثال ہیں۔ شیرانی صاحب کہتے ہیں عبدالغنی نے کام تو بہت کیا مگر وہ اس سے زیادہ کام چھوڑ گئے۔ اس ضمن میں شیرانی نے تیس سے اوپر ایسے شعرا اور ادبا کا ذکر کیا ہے جن کو اس تالیف میں جگہ دی جانے چاہیے تھی۔ اپنے موضوع سے انصاف نہ کر سکنے کا ایک سبب یہ ہے کہ عبدالغنی صاحب اپنے معاصر تحقیقات سے بے خبر تھے اور اسی وجہ سے فہرست مختصر ہے۔

حافظ شیرانی نے بعض معاصر تالیفات و مقامات کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ فہرست مصنف کی کوششوں سے دگنی ہو سکتی تھی۔ گویا شیرانی نے واضح کہا کہ یہ کتاب "ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب" کی تاریخی غلطیاں اور ان کی تصحیح کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ اس حوالے سے مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

"مولف نے بہت سے مقامات پر خیالی اور بے سنہ بیانات درج کر دیے ہیں۔"(۱۴)

چنانچہ شیرانی کا فارسی ادب پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی خامیوں کا ازالہ کیا ہے۔ یہ غلطیاں معلوم مواد کے غلط طور پر برتنے اور خاصی تعداد میں اس دور کے مواد سے صرفِ نظر کرنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں۔ شیرانی صاحب نے اس کتاب سے متعلق ان غلطیوں کی اصلاح کر دی اور بہت سے نئے مواد کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ اس کتاب پر شیرانی صاحب کے تبصرے کو سالوں گزر چکے ہیں جن کی اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

تیسرا مضمون دیوان معین الدین کے موضوع پر ہے اس دیوان کو کسی مغالطے یا مفاد پرستی کے تحت حضرت معین الدین چشتی اجمیری سے منسوب کر دیا گیا ہے اور انہی کے نام سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں مگر حافظ صاحب نے اپنی ژرف نگاہی سے کام لے کر نہایت ہی مدلل انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دیوان در حقیقت ہرات کے مشہور واعظ مولانا معین الدین فراہی کی کاوش طبع کا نتیجہ ہے اور خواجہ اجمیری سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ شیرانی کی دلائل مختصر طور پر درج ذیل ہیں تاریخ خواجہ صاحب کی شاعری اور ان کے دیوان سے ناواقف ہے۔ اس دیوان کی زبان خواجہ اجمیری کے عہد کی زبان ہرگز نہیں ہے بلکہ متاخرین کی زبان معلوم ہوتی ہے اس دیوان میں ایسی کوئی بات نہیں جس کی رو سے اس کا تعلق خواجہ صاحب سے قائم کیا جائے۔

چوتھا مضمون امیر خسرو کی کتاب ''خزائن الفتوح'' سے متعلق ہے۔ اس کتاب کو امیر خسرو کی مشکل ترین کتاب کہا جاسکتا ہے۔ سید معین الحق صاحب نے اس کتاب کو مرتب کر کے علی گڑھ یونیورسٹی کی انجمن تاریخ کے سلسلہ مطبوعات میں سنہ ۱۹۲۷ء میں شائع کروا دیا مگر وہ کتاب کے مختلف مخطوطات کے مقابلے کے بعد ایک قابلِ اعتماد متن کو پیش کرنے کے کام کو فراموش کر گئے۔ اس کے علاوہ لاپرواہی کی بدولت متن میں بے شمار اغلاط سامنے آئیں۔ حافظ صاحب نے ''خزائین الفتوح'' کی اس اشاعت پر بطور تبصرہ ایک مضمون سپردِ قلم کیا جو کہ اس جلد کا چوتھا مضمون ہے۔ شیرانی صاحب نے اس تبصرے میں کتب کے متن میں اغلاط کی افراط کی نشاندہی کی ہے اور بعض اقتباسات کی تصحیح کا کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔

مقالات محمود شیرانی جلد پنجم کا پانچواں مضمون خزائن الفتوح کے ترجمے پر تنقید و تبصرہ سے متعلق ہے۔ ''خزائن الفتوح'' جیسی پر تکلف اور مصنوعی نثر کا انگریزی ترجمہ یقیناً اس کے مرتب کرنے سے بھی زیادہ مشکل ترین کام ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے ایک استاد پروفیسر محمد حبیب صاحب نے اپنے آکسفورڈ کے قیام کے دوران پروفیسر مار گورلیورتھ کے زیر نگرانی ''خزائن الفتوح'' کے انگریزی زبان میں ترجمے کا کام سرانجام دیا۔ ولایت سے واپس آنے پر حبیب صاحب نے اپنے شاگردوں کی معیت میں اس ترجمے پر نظر ثانی کی اور سنہ ۱۹۳۱ء میں اسے شائع کر دیا۔ مگر حافظ صاحب کے بیان کے مطابق خروان صاحب کے بس میں نہیں آئے اور حافظ صاحب نے ایک طویل مضمون میں تنقیدی حوالے سے اس ترجمے کی زبان، تاریخ اور جغرافیے کی فاش غلطیوں کی نشاندہی کی اور درستی کے ساتھ ہی پروفیسر حبیب صاحب کی بعض نظریاتی خامیوں کی طرف اہلِ علم حضرات کی توجہ منعطف کروائی۔ حافظ صاحب اپنی تنقید کے آخر میں لکھتے ہیں:

> ''اگر سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہنا ہمارے فرائض میں داخل ہے تو ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ حبیب نے ایک ایسی کتاب کے ترجمے کا اقدام کیا ہے جس کے سمجھنے کی انھوں نے مطلق کوشش نہیں کی ہے اور مترجم کے فرائض کی طرف سے سراسر بے اعتنائی برتی ہے۔ اس ترجمے میں انھوں نے لغاوت و محاورات اور زبان دانی پر ہر طرح سے کند چھری پھیری ہے وہ اس ترجمے کو جس کی کوئی سطر اسقام سے پاک نہیں پڑے وثوق اور اطمینان کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔''(۱۵)

''مقالات محمود شیرانی'' جلد ششم کے چھٹے مقالے میں حافظ نے ایک گم نام شاعر شہابی کی دلچسپ مثنوی عروۃ الوثقی تالیف سنہ شید ۸۵۹ء سے ہمارا مفصل تعارف کرایا ہے۔ اس مثنوی کا واحد مخطوطہ خود حافظ صاحب کے کتب خانے میں موجود تھا، جو کہ اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ حافظ صاحب نے یہ مضمون ادارہ معارف اسلامیہ کے دوسرے اجلاس منعقدہ لاہور اپریل ۱۹۳۶ء کے لیے لکھا تھا جو بعد ازاں ادارہ ہذا کی روائداد مطبوعہ لاہور میں شائع ہوا۔

"عروۃ الوثقیٰ" کے مولف شہابی کی شخصیت علاقے اور زمانے کی جستجو میں ان کے قلم سے بہت پائے معلومات فراہم ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے بقول:

"شہابی کی مثنوی "عروۃ الوثقیٰ" پر شیرانی مرحوم نے جو تبصراتی جائزہ کیا وہ مرحوم کے نہایت اہم تحقیقی نوشتوں میں ہے۔"(۱۶)

آٹھواں اور آخری مضمون جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور کے مشہور شاعر "ابوبرکات منیر لاہوری" کے سوانح حیات کے موضوع پر ہے اس سے پہلے منیر کے حالات زندگی پر اتنا جامع مضمون نہیں لکھا گیا تھا کہ جتنا محمود شیرانی نے پیش کیا ہے۔ حافظ صاحب کا منیر کی نظم و نثر پر تبصرہ کرنے کا ارادہ بھی تھا اور اس کا اظہار انھوں نے مضمون کے آخر میں کیا تھا، مگر یہ ارادہ شرمندہ تکمیل نہ ہو سکا۔

"مقالاتِ شیرانی" میں حافظ صاحب نے کسی قسم کے بخل اور جانبداری سے کام نہیں لیا گیا۔ حقائق کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے۔ ادبی بھول بھلیوں سے تاریخی سچائیوں کی طرف سوچ کا سفر ہفت خواں طے کرنے کے برابر ہوتا ہے جس میں ژرف نگاہی کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ اس کتاب میں نظر آتی ہے۔

"راج راسا" ایک داستان ہے جو ۱۹۴۲ء میں طبع ہو کر انجمن ترقی اُردو ہند سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب پر تھوی راج چوہان کے درباری کوی چندر بداتی سے منسوب کی جاتی ہے دیسی زبانوں میں یہ سب سے قدیم کتاب ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے خیال میں یہ کتاب کسی بھاٹ یا نقال نے لکھی ہے جس نے راجہ کو خوش کرنے کے لیے مبالغہ آمیز داستان کہی:

"یہ ادبی تعفن جو ابتدا میں کسی معمولی علمیت کے بھاٹ نے محض ذاتی خیال کے فائدے سے راجپوتانہ کے کسی راجہ کو اپنے دام تزویر میں لانے کی اُمید میں کیا تھا اور انجام کار مغرب کے بڑے بڑے علما کو جن کے نام تاریخ اور لسانیات میں بڑے ادب سے لیے جاتے ہیں۔ کامل طور پر گمراہ کرنے میں کامیاب ہوا، مضحکہ کا ایسا شاندار پہلو وہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ جس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تالیف کو بحیثیت کتاب تاریخ تسلیم کرنا ایک عظیم الشان غلطی تھی جو ہمیشہ قابلِ افسوس رہے گی۔"(۱۷)

مقالاتِ شیرانی کی جلد ہفتم "راج راسا" کے بارے میں ہے۔ اس کے تین حصے ہیں:

(۱) مطالب، (۲) تنقید، (۳) راسا پر تبصرہ

جلد ہشتم میں کتب نصاب، عروض اور مسکوکات سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔

حافظ شیرانی اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ قدیم و جدید علوم کا اُن میں ایسا حسین امتزاج تھا کہ تحقیق و تنقید کے میدان میں آج بھی اُن کا شمار یگانہ وقت اور نابغہ روزگار اشخاص میں ہوتا ہے۔ شوکت علی خاں لکھتے ہیں:

”وہ زندہ رہے تو تاریخی کرداروں کو زندہ کرتے رہے اور مرے تو وہ تاریخی کردار آج اُن کو زندہ کیے ہوئے ہیں۔“(۱۸)

حافظ محمود شیرانی کے مقالات معرکۃ الآرا ہیں اور مستقبل کے مصنّفین کے لیے چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سیّد عبداللہ، مقدمہ، ڈاکٹر حافظ محمود شیرانی کی علمی و ادبی خدمات، جلد اوّل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء، ص ۳

۲۔ نذیر احمد ڈاکٹر، شیرازی نمبر، اُردو، سہ ماہی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۲۵

۳۔ حافظ محمود شیرانی، مقالات شیرانی، جلد ۴، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء، ص ۴۷۔۴۸

۴۔ مجلہ مہر ۱۳۴۲ء شمسی، بحوالہ مقالات شیرانی، جلد چہارم، ص ۱۲۴

۵۔ ذبیح اللہ، صفامترجم عندلیب زہرا کاموں پوری، فارسی ادب کے ارتقا کی مختصر تاریخ، لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۷۵ء، ص ۱۹۰۔۱۹۱

۶۔ نذیر احمد، پروفیسر، محمود شیرانی کی تحقیقات، لکھنؤ: دانش محل، ۱۹۵۴ء، ص ۶۲

۷۔ مظہر محمود شیرانی (مرتب)، مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد پنجم: لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء، ص ۴

۸۔ ایضاً، ص ۱۶

۹۔ ایضاً، ص ۴۳۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۳۔ نذیر احمد، پروفیسر، حافظ محمود شیرانی تحقیقی مطالعے، ص ۴۷

۱۴۔ مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر، حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات، لاہور: مجلس ترقی ادب، جلد اوّل، ۱۹۹۳ء، ص ۴۵۲

۱۵۔ مظہر محمود شیرانی، مقالات حافظ محمود شیرانی، ص ۳۴۰

۱۶۔ تنویر احمد علوی، ڈاکٹر، محقق شیرانی اور تاریخی حسیت، مشمولہ: حافظ محمود شیرانی تحقیقی مطالعے، مرتب: پروفیسر نذیر احمد، ص ۳۷۱

۱۷۔ کوی چند ربداتی، پرتھی راج راسا، دہلی: انجمن ترقی اُردو ہند، ۱۹۴۲ء، ص ۶

۱۸۔ شوکت علی خان، مشمولہ: حافظ محمود شیرانی تحقیقی مطالعے، مرتب: پروفیسر نذیر احمد، نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۱ء، ص ۲۸۷

https://tasdeeq.riphahfsd.edu.pk